شبیر احمد خان غوری

حدیث "لاتسبوا الدھر"

اپنے صحیح پس منظر میں

حدیث "لاتسبوا الدھر" میں "دہر" کو جو اللہ کہا گیا ہے، مضمون نگار نے اس کی تردید میں سب سے پہلے قبل از اسلام "دہر" یعنی زمان کے متعلق مختلف قوموں میں جو تصورات پائے جاتے ہیں، انہیں بیان کیا ہے۔ پہلی قسط میں اس فکری ماحول کو پیش کیا ہے، جس میں کہ اسلام مبعوث ہوا۔ مدیر

② اسلام کا تصوّرِ زمان

اسلام کا تصوّرِ زمان اس کی بنیادی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم "توحید ربوبیت" ہے۔ اسی فریضہ کی بجاآوری کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:۔

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" (ذاریات۔ ۵۶) میں نے جن اور آدمی اسی لئے پیدا کئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اور اسی "دعوتِ توحید" کو لے کر تمام انبیاء سابقین مبعوث ہوئے۔

"وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا الٰه الا انا فاعبدون" (انبیاء۔ ۲۵) اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہ بھیجا مگر یہ کہ ہم اس کی طرف وحی فرماتے تھے کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ پس مجھی کو پوجو۔

لیکن قرآن اس بات کو محض ایک تکوینی حقیقت بتا کر ہی نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ یہ ایک تشریعی حقیقت اور ایجابی حکم ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے:۔

"یا ایها الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم" (بقرہ۔ ۲۱) اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا۔

اس فریضہ کی بجاآوری کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام رسولوں اور آخر میں خاتم النبیینؐ کے ذریعے ایک

دستورِ حیات عطا فرمایا جس کے اتباع سے انسان اپنی حیات دنیوی اور حیات اُخروی دونوں کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں "ایمان بالرسالۃ" ہے۔ اس دستورِ حیات پر عمل فرض ہے اور اس لئے انسان کو ایک دن اس فریضہ کی بجا آوری یا اس میں غفلت یا بغاوت کی جواب دہی کے لئے اللہ رب العزت کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

"افحسبتم انما خلقناکم عبثاً وانکم الینا لا ترجعون" (مومنون - ۱۱۵)

[تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف پھر کر آنا نہیں ہے (اور آخرت میں جزا سزا کے لئے اٹھنا نہیں ہے۔ نہیں بلکہ تمہیں عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور اس لئے کہ تم آخرت میں ہماری طرف لوٹ کر آؤ تو تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دیں)]

اسلام کی اس بنیادی تعلیم کا نام "ایمان بالآخرۃ" ہے جس پر اعتقاد اور تیاری کے لئے قرآن بصیغۂ امر حکم دیتا ہے:- "واعلموا انکم ملاقوہ"۔ جہاں تک "ایمان باللہ" اور محض اقرار عبودیت کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی فطرت سلیمہ سے پوچھئے۔ بلا تامل اللہ رب العزۃ کی الوہیت کا اقرار کرے گی۔ قرآن کہتا ہے:-

"ولئن سالتهم من خلق السمٰوٰت والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ فانّٰی یوفکون" (عنکبوت - ۶۱)

اور اگر تم ان سے پوچھو: کس نے پیدا کئے آسمان اور زمین اور کام میں لگائے سورج اور چاند تو ضرور کہیں گے: اللہ نے۔ تو کہاں اوندھے جاتے ہیں؟ (اور باوجود اس اقرار کے اللہ رب العزۃ کی توحید سے منحرف ہوتے ہیں)

اسی طرح "ایمان بالرسالۃ" کا مسئلہ بھی زیادہ پیچیدہ نہ تھا۔ اگر معاملہ صرف ایک "دستورِ حیات" کے نافذ کرنے کا ہوتا تو بہت جلد طے ہو جاتا۔ ہر قوم میں کوئی نہ کوئی مصلح ہوتا ہی ہے۔ نبوت سے پہلے قریش میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امین کے لقب سے پکارے جاتے تھے اور ہر قسم کی نزاعات میں مطاع و واجب الاقتداء سمجھے جاتے تھے نبوت کے بعد بھی قریش نے آپؐ کو بادشاہ بنانے کی پیش کش کی تھی۔ لیکن ساری پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ قرآن کہتا تھا بندوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے اور اپنے اچھے بُرے کا بارگاہ رب العزۃ میں جواب دینا ہے۔ اس "ایمان بالآخرۃ" کی تعلیم کے ساتھ دنیا پرست مترفین خود کو راضی نہیں کر سکتے، کیونکہ محاسبۂ آخرت کا عقیدہ عناں گسیختہ لذت کوشی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ہے۔ آدمی صرف اسی صورت میں دل کھول کر دادِ عیش دے سکتا ہے، جب کہ اس کے دل میں حساب آخرت کا دغدغہ نہ ہو۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

عرب جاہلیۃ بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ان کی لذت پرستی نے بھی "بعث بعد الموت" کے تصور کو عسیر الفہم بنا دیا تھا جیسا کہ اوپر ایک جاہلی شاعر کا قول نقل ہوا۔

مگر اس حقیقت تک ہر سلیم الفطرۃ انسان کا پہنچنا ناگزیر ہے کہ اس دنیوی زندگی کے بعد اُخروی زندگی بھی آنے والی ہے۔ کیونکہ اگر آخرت نہیں ہے، عالم دوبارہ نہیں ہے۔ بعث بعد الموت نہیں ہے، تو پھر آخر ہماری زندگی کیا ہے، کیوں ہے اور کس کے لئے ہے؟ عاقبت فراموش مترفین عرب نے اس سنجیدہ سوال کا ایک ناقص جواب تراش لیا تھا کہ ہماری زندگی اسی حیاتِ دنیوی تک محدود ہے اور ہمیں دوبارہ زندہ ہونا نہیں ہے۔ قرآن ان کے قول کو نقل کرتا ہے :۔

"وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین۔" (انعام - ۲۹) [اور بولے وہ تو یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہمیں مرکر دوبارہ اٹھنا نہیں۔]

لیکن اگر ایسا ہے تو پھر یہ ہنگامہ حیات و ممات کیوں؟ کائنات کا خلاق علیم و حکیم تو اس قسم کی عبث اور بے مقصدی رچنا نہیں رچا سکتا۔ اس کا جواب یہ لوگ اس طرح دیتے تھے کہ یہ سارا ہنگامہ "بود و نابود" ایک دوسرے مؤثر کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے، جس کا نام "دہر" ہے۔ یہ معطلۂ عرب کا کہنا تھا، جس کا تفصیلی ذکر اوپر آچکا ہے اور جو یہ کہتے تھے :۔

"وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحی وما یھلکنا الا الدھر۔" [اور بولے وہ تو یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور نہیں ہلاک کرتا ہے ہمیں مگر صرف دہر و زمانہ۔]

قرآن زنادقۂ عرب کے اس عقیدہ "دہر پرستی" پر سرزنش کرتا ہے، کیونکہ

(الف) یہ آخرت کے عقیدے سے، جو اسلام کی بنیادی تعلیمات میں رکن رکین کی حیثیت رکھتا ہے، انکار کا بہانہ تھا۔

(ب) "وحدہٗ لاشریک لہ" اور "فعالٌ لما یرید" پر ایمان لانے کے بعد کسی دوسرے موثر کی کارفرمائی پر اعتقاد اسلام کی دعوتِ توحید کے منافی ہے۔

(ج) "زمانہ پرستی" کا عقیدہ جبر و قنوطیت کا مُورث ہے (اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے) اور یہ چیز اسلام کی معاشرتی تعلیم کے لئے سم قاتل ہے۔

لہٰذا اسلام اس "قول بالدہر" کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ زمانہ (دہر) کو "مفنی و مہلک" سمجھنے یا موثر فی الوجود ماننے پر سخت سرزنش کرتا ہے اور اس عقیدہ کو ژولیدگی وہم و تخییل کی پیداوار بتاتا ہے۔ چنانچہ قرآن معطلۂ عرب کے اس "قول بالدہر" کی حکایت کے فوراً بعد اس عقیدے کی مخالفت اور اس کے معتقدین کی نادانی و جہالت کا اعلان کرتا ہے :۔

"وما لھم بذلك من علم ان ھم الا یظنون" (جاثیہ - ۲۴) [اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور انہیں اس کا کوئی علم نہیں (یعنی وہ یہ بات بے علمی سے کہتے ہیں) اور وہ تو نرے گمان (خلاف واقع) دوڑاتے ہیں]

زمانہ کے متعلق اسلام کا موقف

اس معاتبانہ انداز نے "دہر" اور "زمانہ" کے متعلق اسلام کا موقف متعین کر دیا۔ چنانچہ علماء اسلام نے شروع ہی سے "زمانہ" یا "دہر" کو ایک "غیر موثر مخلوق" بلکہ ایک "امر اعتباری" قرار دیا، جو کسی حقیقی وجود کے ساتھ متصف نہیں ہے۔ اور معاشرتی زندگی کی عملی ضرورتوں کے لئے صرف ایک پیمانہ ہے اور بس

"الوقت ما توقته للشئ" (مقالات الاسلامیین للامام الاشعری الجزء الثانی صد ۴۴۳)۔ [وقت وہ ہے جو تم کسی بات کے لئے مقرر کر لو۔]

یا متاخرین کے لفظوں میں:

"متجدد معلوم یقدر بہ متجدد آخر موھوم"۔ (کتاب التعریفات للجرجانی)۔ [زمانہ ایک متجدد معلوم ہے جس سے دوسرے مجہول متجدد کا اندازہ لگایا جاتا ہے]

ورنہ بقول اقبالؒ: خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں لاالہ الا اللہ

غرض اسلامی فکر میں: (۱) مجادلانہ طور پر تو زمانہ کے وجود خارجی ہی سے انکار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ "شرح المواقف" میں ہے۔ "انھم اعنی متکلمین ..... انکروا ایضاً الزمان"۔ [انہوں نے یعنی متکلمین نے .... زمانہ کے وجود خارجی و حقیقی کا بھی انکار کیا ہے۔]

(۲) لیکن محققانہ طور پر زمانہ کو مخلوق (حادث) اور "غیر موثر فی العالم" مانا جاتا ہے۔ چنانچہ امام نووی نے "شرح صحیح مسلم" میں لکھا ہے:۔ "واما الدھر الذی ھو الزمان فلا فعل لہ بل ھو مخلوق من جملۃ خلق اللہ تعالیٰ"۔ [رہا دہر جو زمانہ کا نام ہے، تو وہ غیر موثر ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔]

(۳) اور عملی طور پر وہ "توقیت" کا پیمانہ ہے۔ "متجدد معلوم یقدر بہ متجدد آخر مبھم"۔

③ حدیث لاتسبوا الدھر

زمانہ جس طرح گردش لیل و نہار کا نام ہے، اسی طرح دنیا میں شادی و غم، فراخی و تنگدستی اور عیش وصال و تلخی فراق کا چکر لگا رہتا ہے اور جس طرح وہم غلط کار دن کو رات اور رات کو دن کی علت قرار دے دیا کرتا ہے، اسی طرح "واہمہ کی مشق پیہم" نے آلام روزگار کو زمانے ہی کے ماتھے تھوپ دیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ زروانی عقائد

ساسانیوں کے زمانہ میں جبر کا عقیدہ پیدا کرنے میں ممد ہوئے تھے کیونکہ "زروانیت" میں خدائے قدیم "زروان" نہ صرف زمان نامحدود ہی کا نام تھا، بلکہ "تقدیر" بھی وہی تھا۔ اسی طرح دیگر اقوام قدیمہ میں بھی نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم لٹریچر میں "شکوہ گردش روزگار" نے مسلّمات کی حیثیت حاصل کر لی۔ عرب کا لٹریچر اس سے کیوں محروم رہتا۔ اس نے بھی "ستم ہائے روزگار" کے شکوؤں کا دفتر کھول دیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "ومایھلکنا الا الدھر" کی شان نزول میں لکھا ہے

"وکانت عادتھم اذا اصابھم مکروہ اضافوہ الی الدھر۔ فقالوا بؤساللدھر وتبا للدھر"۔ (فتح الباری جلد ۲۰ صفحہ ۳۰)

اور عربوں کی عادت تھی کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی تو وہ اس کو "دہر" کی جانب منسوب کرتے اور کہتے بُرا ہو "دہر" کا اور بربادی ہو "دہر" کے لئے۔

اسی طرح امام ابوبکر جصاص الرازی (المتوفی ۳۷۰ھ) نے لکھا ہے:۔

"ان اھل الجاھلیۃ کانوا ینسبون الحوادث المجحفۃ والبلایا النازلۃ والمصائب المتلفۃ الی الدھر۔ فیقولون فعل الدھر بنا ولیسبّون الدھر کما جرت عادۃ کثیر من الناس بان یقولوا اساء بنا الدھر ونحو ذلک"۔ (احکام القرآن للجصاص الرازی: المجلد الثالث صفحہ ۴۷۹)

اہل جاہلیت تباہ کن حادثوں اور مصیبتوں اور بلاؤں کو دہر کی جانب منسوب کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: ہمارے ساتھ دہر نے یہ کیا ہے اور زمانہ کو گالی دیا کرتے تھے جیسا کہ اکثر لوگوں کی یہ کہنے کی عادت ہوتی ہے کہ زمانہ نے ہمارے ساتھ برائی کی اور اس جیسے دوسرے شکوے۔

اسلام نے بڑی حد تک اس مفسدہ کی اصلاح کی (تفصیل آگے آ رہی ہے)۔ پھر بھی لوگ جیسا کہ امام جصاص رازی نے لکھا ہے۔ عہد جاہلیہ کی اس "ادبی روایت" کا تتبع کرتے رہے۔ بڑے بڑے دیندار مسلمان بھی محض تفنن طبع کے لئے زمانہ اور دہر کو دو چار باتیں سنا لیا کرتے تھے۔

لیکن شکوہ سنجی روزگار میں بڑے مفاسد مضمر تھے۔ بے مہریِ روزگار اور کجرویِ انجم و افلاک کی شکوہ طرازی کی عادت افراد و اقوام کو آہستہ آہستہ بے عمل بنا دیتی ہے۔ بالخصوص حوادث کائنات میں گردش افلاک کو موثر بالذات ماننے کا عقیدہ انسان کی قوائے عمل کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اسلام جسے اپنے متبعین سے دنیا کی امامت کا کام لینا تھا انہیں اس کھلی ہوئی ضلالت و گمراہی میں کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ پھر اسلامی تعلیم میں، جس کا اصل الاصول "نفی غیر اللہ" کا اعلان ہے، اس الحاد کی گنجائش کہاں کہ زمانہ جیسے اصنام خیالی کو آزار رسانیِ خلائق پر قادر مانا جائے۔ اس لئے اللہ کے رسولؐ نے اللہ کے بندوں کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا کہ

"یقول اللہ تعالیٰ یوذینی ابن آدم یسبّ الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار" [اللہ رب العزۃ فرماتا ہے کہ آدمی زمانہ کو گالی دے کر مجھے اذیّت پہنچاتا ہے، حالانکہ میں ہی منقلّب دہر ہوں۔ میرے ہی قبضۂ قدرت میں اختیار و تصرف ہے۔ میں ہی لیل و نہار کو الٹ پھیر کرتا ہوں۔]

یہ تھا اس "ارشادِ نبوت" کا منشاء و مفہوم۔ محققین نے اس کا کیا مطلب سمجھا، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے مگر بعد کے مصلحین ملّت نے حدیث کے ٹکڑے "وانا الدھر" سے عجب عجب اعجوبہ تراشیاں فرمائیں۔ انھوں نے زمانہ ہی کو خدا بنا دیا۔ "DO NOT VILIFY TIME FOR TIME IS GOD" حالانکہ سیاقِ عبارت اور عربی زبان کے عام قواعد اس قسم کی "معنیٰ آفرینیوں" کی کسی طرح بھی اجازت نہیں دیتے۔

حدیث لاتسبوا الدھر قواعدِ کلام عرب کی روشنی میں

اس لسانی تنقید کا ماحصل یہ ہے :-

اولاً :- یہ حدیث مختلف متون کے ساتھ مروی ہے۔ ایک حدیث میں "وانا الدھر" ہے۔ دوسری میں "فانی انا الدھر" ہے اور یہی دونوں متن اصل حدیث ہیں۔ تیسرا متن جس میں "فان اللہ ھو الدھر" منقول ہے، وہ حسب تصریح محققین غلط ہے اور غیر محتاط روایت بالمعنیٰ کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ امام ابوبکر جصاص الرازی نے اس حدیث کے دوسرے متن "ان اللہ یقول لا یقولن احدکم یاخیبۃ الدھر فانی انا الدھر اُقلب لیلہ ونہارہ" کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :-

"فھذان ھما اصل الحدیث فی ذلک والمعنیٰ ما ذکرنا وانما غلط لبعض الرواۃ فنقل المعنیٰ عندہ فقال : لاتسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر"۔ (احکام القرآن للجصاص الرازی المجلد الثالث صفحہ ۴۷۹)

پس اس باب میں حدیث کی یہی دو اصل ہیں اور ان کے معنی وہی ہیں جو ہم نے ذکر کئے اور بعض راویوں نے غلطی کی جو معنی معہود کو غلط نقل کر کے روایت بیان کی اور کہا کہ لاتسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر۔

ثانیاً :- روایاتِ مشہورہ میں "انا الدھر" کے اندر "دہر" کا اعراب مختلف فیہ ہے۔ محققین اس کے "نصب" (رَ کے زبر) کے قائل ہیں۔ چنانچہ فقہاء میں سے امام ابوبکر جصاص الرازی میں لکھتے ہیں :-

"فقولہ انا الدھر منصوب بانہ ظرف للفعل کقولہ تعالیٰ انا ابداً بیدی الامر اُقلب اللیل والنھار وکقول القائل انا الیوم بیدی الامر افعل کذا وکذا۔ ولو کان مرفوعاً کان الدھر اسماً

پس قول نبوی "انا الدھر" میں "دہر" منصوب (بفتحہ ر) ہے کیونکہ یہ ظرف فعل ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا قول "انا ابداً" میں ہمیشہ ہوں، میرے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے، میں ہی دن رات کو الٹ پھیر کرتا ہوں۔ یا جس طرح کہنے والے کا قول "انا الیوم" آج

لله تعالیٰ ولیس کذلک لان احداً من المسلمین لا یسمی اللہ بھذا الاسم۔" (احکام القرآن: المجلد الثالث صفحہ ۴۷۹)

میں ہی ہوں۔ میرے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے، ایسا اور ایسا کروں گا۔ اور اگر "دہر" مرفوع (بضمۂ ر) ہوتا تو یہ اسمائے باری میں سے ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو اس نام سے موسوم نہیں کرتا۔

اسی طرح محدثین میں سے محمد بن داؤد ظاہری "الدھر" کے ر کو مفتوح پڑھتے تھے۔ شنقیطی نے ان کا قول نقل کیا ہے۔

"وکذلک قال محمد بن داؤد محتجاً لما ذھب الیہ انہ یفتح الراء۔ فکان یقول لو کان بضمھا کان الدھر من اسماء اللہ تعالیٰ۔" (استحالۃ المعیۃ بالذات صفحہ ۳۴۵)

اسی طرح محمد بن داؤد نے اپنے مسلک کی حجت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ "دہر" ر کے زبر کے ساتھ ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر ر کو پیش ہوتا تو "دہر" اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہوتا۔

امام نووی نے "شرح صحیح مسلم" میں اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے۔

قولہ عزوجل وانا الدھر فانہ یرفع الراء ھذا ھو الصواب المعروف الذی قالہ الشافعی والوعبید وجماھیر المتقدمین والمتاخرین وقال ابوبکر ومحمد بن داؤد الاصبھانی الظاھری انما ھو الدھر بالنصب علی الظرف ای انا مدۃ الدھر اُقلب لیلہ ونھارہ۔ وحکی ابن عبدالبر ھذہ الروایۃ عن بعض اھل العلم وقال النحاس یجوز النصب ای فان اللہ باقٍ مقیم ابداً لا یزول۔ قال القاضی قال بعضھم ھو النصب علی التخصیص قال والرفع اصح واصوب۔ واما روایۃ الرفع فموافقۃ لقولہ فان اللہ ھو الدھر۔" (امام نووی: شرح صحیح مسلم جلد ثانی صفحہ ۲۴۷)

اللہ عزوجل کا قول "انا الدھر" ر کے پیش کے ساتھ ہے اور یہی صحیح اور مشہور ہے۔ اسی کے قائل امام شافعی، ابوعبید اور جمہور محدثین متقدمین و متاخرین ہیں۔ مگر ابوبکر بن حصاص الرازی اور محمد ابن داؤد اصفہانی کا کہنا ہے کہ وہ "دہر" زبر کے ساتھ ہے بر سبیل ظرفیت۔ یعنی "میں ہمیشہ ہمیشہ ہوں، اس کے رات دن کو گردش دیتا ہوں"۔ ابن عبدالبر نے اس روایت کو بعض اہل علم سے نقل کیا ہے۔ نحاس کا کہنا ہے کہ یہاں نصب (زبر) بھی جائز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ قاضی کا کہنا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے یہاں نصب بر وجہ تخصیص ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ ظرف کا ماننا ہی زیادہ صحیح اور مناسب ہے۔ رہی پیش والی روایت تو وہ اس وجہ سے ہے کہ "فان اللہ ھو الدھر" والی روایت سے موافقت ہو جائے۔

اس سے ظاہر ہے کہ "دہر" کا ظرف زیادہ صحیح ہے۔ رہی رفع والی قرأت تو وہ "فان اللہ ھو الدھر" کے ساتھ تطبیق میں ممد ہے۔ لیکن امام ابو بکر جصاص الرازی کی تصریح اوپر مذکور ہو چکی ہے کہ یہ غیر محتاط روایت بالمعنی کا نتیجہ ہے اور اسی لئے رواۃ نے اس کے نقل معنی میں غلطی کی ہے: "وانما غلط بعض الرواۃ فنقل المعنی عندہ"۔ بہر حال محققین کے نزدیک "دھر" لفظ "اللہ" کی خبر نہیں ہے کہ دونوں میں عینیت کا شبہ پیدا ہو، بلکہ ظرف ہے اور معنی وہی ہیں جو امام ابو بکر جصاص الرازی نے فرمائے ہیں کہ "ہمیشہ رہنے والا ہوں"۔

ثالثاً:- جمہور محدثین جو "رفع" کے قائل ہیں اور "الدھر" کی "ر" کو مضموم (پیش کے ساتھ) پڑھتے ہیں، ان کے نزدیک بھی یہ "حذف مضاف" کے قبیل سے ہے جو قرآن اور اسی طرح کلام عرب کا عام اسلوب بیان ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے:- "واسئل القریۃ"۔ حالانکہ گاؤں (قریہ) ایک بے جان چیز ہے، اس سے "پوچھنا" کیا معنی۔ بلکہ مراد "اھل القریۃ" ہے۔ (یعنی گاؤں کے باشندوں سے پوچھو)۔ مضاف کو حذف کر کے اس کا اعراب مضاف الیہ کو دے دیا جاتا ہے۔ اسی اصول پر اس حدیث میں مضاف محذوف ہے جو "صاحب" یا "مقلب" یا اس قسم کا اور کوئی لفظ ہے۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی نے امام خطابی (المتوفی ۳۸۷ھ) سے "وانا الدھر" کے معنی میں نقل کیا ہے:-

"قال الخطابی معناہ انا صاحب الدھر ومدبر الامور التی ینسبونھا الی الدھر"۔

امام خطابی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں "میں دہر کا مالک ہوں اور ان امور کی تدبیر کرنے والا ہوں جسے یہ لوگ دہر کی طرف منسوب کرتے ہیں"۔

رابعاً:- امام راغب اصفہانی نے جو "مفردات قرآن" کے باب میں سند سمجھے جاتے ہیں، بعض اہل لغت کا قول نقل کیا ہے کہ "لیسب الدھر" کا "دھر" "انا الدھر" کے دہر سے مختلف ہے۔ پہلے سے مراد "زمانہ" اور دوسرے سے "زمانہ کا لوٹانے والا" چنانچہ شنقیطی نے لکھا ہے:-

"فقد حکی الراغب ان الدھر فی قولہ ان اللہ ھو الدھر غیر الدھر فی قولہ لیسب الدھر والدھر الاول الزمان والثانی المدبر المصرف لما یحدث"۔ (استحالۃ المعیۃ بالذات صفحہ ۲۴۵)

پس امام راغب نے بیان کیا ہے کہ وہ "دھر" جو قول نبوی "ان اللہ ھو الدھر" میں واقع ہے، اس دہر سے جو دوسرے قول "یسب الدھر" میں آیا ہے، مختلف ہے۔ پہلے دہر (یسب الدھر) کے معنی زمان کے ہیں اور دوسرے دہر (ان اللہ ھو الدھر) کے معنی ہیں حوادث کی تدبیر کرنے والا اور ان میں تصرف کرنے والا یا انہیں گھمانے والا۔

خامساً:- علی سبیل التنزل فرض کر لیجیئے کہ "انا الدھر" میں "انا" مبتدا اور "دھر" خبر ہے اور معنی ہیں کہ "اللہ دہر ہے" یا "دہر اللہ ہے" تو اللہ رب العزۃ کے قول اور اس کے رسول پاک کے قول میں ناقابل حل تناقض

پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر "دہر اللہ ہے" اور اللہ تعالیٰ حسب تصریح قرآن، زندہ کرنے والا اور ہلاک کرنے والا ہے (ھو یحی ویمیت) تو پھر مشرکین عرب کے قول پر کہ "وما یھلکنا الا الدھر" قرآن کے گرفت اور سرزنش کرنے کا کہ "وما لھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون" کیا محل ہو سکتا ہے۔

سادساً:۔ اس تفریق بین اللہ و رسولہ سے بھی قطع نظر کیجئے تو "انا الدھر" میں "انا" اور "دھر" کو بغیر تقدیر حذف مضاف، مبتدا اور خبر ماننے میں حدیث کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے:۔

"میں دہر ہوں، میرے ہی ہاتھ میں امر ہے اور میں ہی اپنے کو (لیل و نہار کو) الٹ پھیر کرتا ہوں"۔

اس لئے کہ "سلسلہ روز و شب" دہر ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن یہ ایسا عجیب اسلوب بیان ہے، جسے کوئی ہوش مند انسان اختیار نہیں کر سکتا۔ افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو اس سے کہیں بلند ہے۔ چنانچہ شنقیطی نے بعض محققین علماء حدیث کا قول نقل کیا ہے:۔

وکفی فی الرد علیھم فی بقیۃ الحدیث	اور اس قسم کے شک کرنے والوں کی تردید کے لئے باقی حدیث کافی ہے۔
انا الدھر اُقلب لیلہ ونھارہ فکیف یقلب	(کیونکہ اس صورت میں معنی ہوں گے) میں دہر ہوں اور دہر کے
الشئ نفسہ تعالی اللہ عن قولھم علوا کبیرا۔"	لیل و نہار کو الٹ پھیر کرتا ہوں۔ بھلا کوئی چیز خود کو کس طرح
(استحالۃ المعیۃ بالذات صفحہ ۳۴۶)	الٹ پھیر کر سکتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان لوگوں کی ہفوات سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

پس ارشاد نبوی "لاتسبوا الدھر" کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے کہ ان حوادث کے فاعل کو برا مت کہو، کیونکہ ان کا حقیقی فاعل اور پیدا کنندہ صرف اللہ تعالیٰ ہے جیسا کہ امام جصاص الرازی فرماتے ہیں:۔

"فقال النبی صلے اللہ علیہ وسلم لاتسبوا فاعل	پس جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ان امور کے
ھذہ الامور فان اللہ ھو فاعلھا ومحدثھا۔"	فاعل کو گالی مت دو۔ کیونکہ ان کا کرنے والا اور پیدا کرنے والا
(احکام القرآن، المجلد الثالث صفحہ ۴۷۹)	اللہ تعالیٰ ہی تو ہے۔

اسی طرح "انا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار" کے معنی ہیں: میں ہمیشہ رہنے والا اور بقائے ابدی کے ساتھ متصف ہوں (حالانکہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ بلکہ) میں ہی لیل و نہار (زمانہ) کو الٹ پھیر کرتا ہوں (پس عجب نادان ہو کہ ہمیشہ رہنے والے الحی والقیوم کو بھول کر زمانہ کو جو خود گردش کے لئے مجبور ہے، حوادث کائنات پر متصرف اور ایذا رسانی خلق پر قادر مانتے ہو۔) یہی توجیہ امام جصاص رازی نے کی ہے (تفصیل آگے آ رہی ہے)

یہ ایک مفسر و فقیہ کی رائے تھی۔ محدثین کا قول مختار امام نووی نے "شرح صحیح مسلم" میں بیان کیا ہے:۔

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لاتسبوا الدھر فان	جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاتسبوا الدھر فان

الله هوالدھر اے لاتسبوا فاعل النوازل فانکم اذا سببتم فاعلها وقع السب علی الله تعالیٰ لانہ فاعلها ومنزلها۔ واما الدھر الذی هوالزمان فلافعل لہ بل ھو مخلوق من جملۃ خلق الله تعالیٰ ومعنی فان الله ھو الدھر ای فاعل النوازل والحوادث و خالق الکائنات۔" (شرح صحیح المسلم جلد ثانی صفحہ ۲۳۷)

الله ھوالدھر یعنی ان مصیبتوں کے فاعل کو گالی مت دو، کیونکہ جب تم ان کے فاعل کو گالی دو گے تو وہ گالی اللہ تعالیٰ پر پڑے گی، کیونکہ وہی ان کا کرنے والا اور نازل کرنے والا ہے۔ رہا "دہر" جو زمانہ ہے تو اس کا کوئی فعل نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی بے شمار مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ اور "فان الله ھوالدھر" کے معنی ہیں ان مصیبتوں اور حادثوں کا فاعل اور کائنات کا خالق اللہ ہی ہے۔

غرض اسلامی تعلیم کی رو سے زمانہ ایک غیر مؤثر امر ہے، جس کا حوادث کائنات اور ان کے خوب و ناخوب میں کوئی دخل نہیں ہے۔ وہ صرف خلّاق کائنات کی بے شمار مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت کریمہ اور حدیث نبوی کے معنی اس قدر واضح اور بین ہیں تو پھر "الدھر" اور "انا الدھر" کے مفہوم میں اتنی قیل وقال کیوں؟ اور پھر "فان الله ھوالدھر" کا کیا مطلب ہے؟ اس کے لئے ہمیں اسلام کی فکری تاریخ کے ان "زیر سطحی" دھاروں پر نظر ڈالنا ہوگی، جو اسلامی سماج میں جاری تھے۔ لوگوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے لئے انھوں نے اپنے پچھلے مذہب کی "بنیادی تعلیمات" کو خیرباد کہا اور اسلام کی اصولی تعلیمات کو اختیار کیا۔ لیکن قدیم مذہب کی جزئیات غیر ارادی طور پر تحت الشعور میں پڑی رہ گئیں اور نئے دین کی جزئیات حاصل کرنے کی فرصت نہیں ملی جو جزئی مسائل منقح ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں اسلامی تعلیمات میں سے کوئی چیز ایسی ملی جو ان کے قدیم خیالات سے کچھ بھی مناسبت رکھتی تھی، وہیں نفسیاتی طور پر ان کا تحت الشعور جاگ اٹھا اور پرانے خیالات کے مطابق نئی تعلیم کی تعبیر کر ڈالی۔

مثلاً راوی اوّل نے حدیث کے اس ٹکڑے "وانا الدھر" کو بفتح را (علی سبیل الظرفیۃ) یا بضم را (علی تقدیر حذف مضاف) روایت کیا۔ بعد کے کسی راوی نے جس کے ذہن میں زمانہ کی متالہانہ عظمت غیر شعوری طور پر پڑی ہوئی تھی "انا" اور "دہر" کو مبتدا اور خبر سمجھ لیا اور چونکہ "روایت بالمعنی" شائع ہو ہی چکی تھی، اسے غیر شعوری طور پر زیادہ مؤکّد بنانے کے لئے "ان الله ھوالدھر" سے تعبیر کر ڈالا۔ اسی بنا پر امام جصاص الرازی نے "احکام القرآن" میں لکھا ہے:

"وانما غلط بعض الرواۃ فقال لا تسبّوا الدھر فان الله ھوالدھر۔"

(مسلسل)